میں سرسید کے بارے میں جو تاثر جاگزیں ہوا‘ وہ سید موصوف کی ذاتِ اصلی کے کسی طور پر بھی مترادف نہیں ہے۔

جناب مرتب کی اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں سید موصوف کی مسخ شدہ شخصیت سے پردہ اٹھا کر اصل احوال سے روشناس کرانے کی ایک اجتہادی کاوش ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا فکری پس منظر تو یہ ہوا۔

اب آتے ہیں خاص اس کتاب کے تعارف کی طرف۔ کتاب کے حرفِ اوّل میں جناب ضیاء الدین لاہوری صاحب نے جو وجوہات تالیف بیان کی ہیں‘ اس کی تلخیص یہ ہے کہ عہد سرسید سے لے کر آج تک سرسید پر لکھے جانے والے عظیم ذخیرے کا خصوصی مطالعہ کر کے چیدہ چیدہ اقتباسات کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور یہ التزام برتا جائے کہ اس انتخاب میں موافقین ومخالفین دونوں سے اقتباس کیا جائے کیونکہ سرسید اور ان کی شخصیت اور کاموں کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے کے لیے دونوں پہلوؤں کا مطالعہ ضروری ہے اور اسی طرح سے سرسید کی اصلی شخصیت نکھر اور نتھر کر سامنے آ سکے گی۔

انھوں نے یہ کام کرنا چاہا سو کر گزرے اور جس تحقیقی عمدگی سے کر دکھایا‘ وہ اس پر صد ہزاراں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب عہد سرسید سے لے کر آج تک کی ”سرسیدیات“ کا ایک جامع انتخاب ہے۔ اس میں سب سے پہلے رفقائے سرسید کا انتقاد ہے۔ اس کے بعد دیگر ہم عصر ناقدین سے اقتباس ہیں۔

سرسید کے بارے میں دیئے جانے والے فتاویٰ کو بطور خاص شامل کتاب کیا گیا ہے تاکہ اس مشہور عام غلط فہمی کی حقیقت کھل سکے کہ ”مولویوں نے انگریزی وسائنسی علوم کی مخالفت کے لیے سرسید کے خلاف کفر کے فتوے دیئے تھے۔“ اس کے علاوہ عہد سرسید کے بعد سے آج تک کے ناقدین کی تحریروں سے اقتباسات ہیں اور آخر میں خود جناب سید کے چند ٹکڑے ہیں۔

اس کتاب کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس نے اپنے تمام اہداف بخوبی حاصل کر لیے ہیں۔ بلکہ اگر عربی محاورہ اختیار کیا جائے تو یہ کتاب مبتدی کے لیے وافی، طالب کے لیے شافی اور متخصص کے لیے کافی ہے۔

کتاب: قرآن کے دو باب مصنف: مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

ناشر: الفرقان بک ڈپو، ۳۱/۱۱۴، نظیر آباد، لکھنؤ ۱۸۔ بھارت

تفسیر کلامِ الٰہی ان ذمہ داریوں میں سے ایک ہے جو علمائے امت کو انبیاء کی وراثت سے نصیب ہوئی ہیں۔ مفسر درحقیقت نائب نبی ہوتا ہے اور مسندِ انبیاء پر نیابتاً عامۃ الناس کو اپنے رب کے کلام کا مفہوم اپنی زبان میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو خاص اسی مقصد کے لیے اپنے بندوں میں بھیجا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک سے زائد آیات سے یہی معنی مفہوم اخذ ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ نبی اور غیر نبی کی تفسیر میں فرق تو ہوگا کہ نبی نے تو آیات قرآنی کی تفہیم میں بغیر وحی کے کچھ بولنا ہی نہیں۔ ان کا سب کا سب بیان وتوضیح وحی ہی وحی ہے اور غیر نبی کو وحی بالکل ہونی ہی نہیں۔ جب کہ عقول عامہ کے لیے تفہیماً تفسیر نگاری بھی ہر دور میں ضروری ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام نے اپنے تلامذہ کو کلامِ الٰہی کی آیات کے جو معانی تعلیم فرمائے‘ انھوں نے اسے اچھی طرح یاد کیا اور لفظ بہ لفظ اپنی آئندہ نسل کو منتقل کر دیا۔ انھوں نے آئندہ کو‘ اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ کسی خارجی تحریک یا داخلی ناصلاحی کی وجہ سے وہ ان وحی شدہ معانی سے محروم

ہو گئے۔ یہ ایک فطری عمل تھا جو کہ امم سابقہ میں ہوتا رہا۔

لیکن قرآن کریم چونکہ آخری کتاب تھی۔ اس کے بعد کسی اور مصلح نے کسی بندے یا کسی کتاب کی صورت میں آنا نہیں تھا اور اللہ نے اس کی حفاظت کا لفظاً و معناً وعدہ بھی اپنے ذمے کر رکھا تھا۔ لہٰذا اس نے حفاظت کی ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ اوّلین ادوار میں ایسے رجال کار کو پیدا فرمایا جنھوں نے شارحِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال و اعمال کو جو کہ بذریعۂ وحی معانی و مفاہیم قرآن ہی ہیں، جمع کر لیا اور جمع کے ایسے کڑے اصول بھی متعین کیے کہ اب تا قیام قیامت کم از کم کسی خارجی تحریک کے زیر اثر یہ مفاہیم و معانی محرف نہیں کیے جا سکتے۔

رہی بات داخلی نا صلاحی یا عدم استعداد و ضعف استعداد کی۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ یہ ایک فطری عمل ہے کہ اگلوں کی صلاحیت پچھلوں کے مقابلے میں نہیں کھڑی کی جا سکتی۔ اس لیے اس میدان میں بھی ایسے لوگ اللہ نے پیدا فرما دیئے جنھوں نے ہر زمانے کے محاورے، مذاق اور عرف کا لحاظ و خیال رکھتے ہوئے اِنھی اوّلین (وحی کے) اصولوں پر ہی نئے سرے سے معانی و مفاہیم کی تعبیر کی۔ اب اس میں بھی اگر کسی نے ان اصولوں سے انحراف کی کوشش کی تو امت کے مذاقِ عام نے اسے بالکل ردّ کر دیا۔

کسی چیز کی تفسیر کی ضرورت اس کے سمجھ نہ آنے کے وقت پڑتی ہے۔ بظاہر قرآن کریم کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ اس معاملے کے ممکنہ طور پر تین حل ہو سکتے ہیں: اوّل یہ کہ قرآن کے بعض مقامات چونکہ بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے، اس لیے سب لوگوں کو اس کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے یعنی قرآن مجید کو بالکل چھوڑ دینا چاہیے۔ دوسری صورت یہ کہ جو بعض مقامات سمجھ میں نہیں آتے، ان کی تعبیر و توضیح ہم خود کریں اور جیسی چاہیں کریں اور جتنا زور لگانا پڑے لگائیں، چاہے اس تاویل بافی اور تعقیل کاری میں سرسید کی سی کیفیت ہو جائے۔ جس کو انھی کے ایک رفیق عملی اور انھی کی طرح سامراج دوست بلکہ سامراج پرست جناب ڈپٹی نذیر احمد نے چوتڑوں سے کان گانٹھنے سے تشبیہ دی ہے۔

اس مکتبۂ فکر کے حاملین کی فہرست بھی کافی ذخیرہ رکھتی ہے لیکن عقل سلیم پر اس طرزِ عمل کا غیر فطری ہونا بالکل ظاہر ہے۔ تیسرا اور آخری ممکنہ حل یہ ہے کہ عقول عامہ جب آیاتِ قرآنی کے فہم و ادراک میں اپنے نارسائی سے شکست کھائیں تو مفسرِ وقت، شارحِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول مفاہیم و معانی کو آسان زبان و محاورہ میں بیان کر دے اور وحی کے اِنھی منقول اصولوں کی روشنی میں جو کچھ بہتر تعبیر متبادر اس کے قلب میں وارد ہو اس کو بھی بیان کر ڈالے۔ اسی کو امت کے بہترین علماء کی ایک کبیر و کثیر جماعت نے اختیار کیا ہے۔ یہ مذاق اور یہ مزاج میری رائے میں اس کتاب کے مصنف کا معلوم ہوتا ہے۔

فاضل مصنف نے ایک عظیم الشان علمی ماحول میں تربیت پائی ہے۔ آپ کو گھر میں اپنے عظیم والد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کا فیض تربیت ملا تو درس گاہ میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کا فیض علم و روحانیت نصیب ہوا۔ چنانچہ روایت کی آبرو کا پاس تو یوں چھٹ نہیں سکتا۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ آپ محض ایک ہی ماحول سے آگاہ ہوں۔ دیگر کچھ معلوم نہ ہو سو عصر حاضر کے محاورے و مشکلاتِ عقلیہ سے واقفیت بھی نہ پائی جائے۔ آپ کی